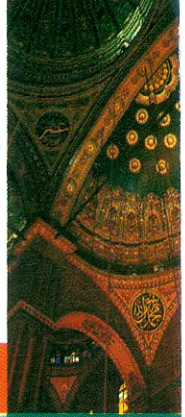

خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ

امالی ڈاکٹر غلام محمد

کراچی کے ماہنامہ "ساحل" (جون ۲۰۰۶ء) میں سید سلیمان ندوی سے منسوب ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے، اس کا اتنا ہی طویل عنوان ہے: "خطبات اقبال، خطبات کا ناقدانہ جائزہ- علامہ سید سلیمان ندوی کی نظر میں امالی ڈاکٹر غلام محمدؒ" اس مقالے میں انہوں نے اقبال کے ان خیالات پر شدید گرفت کی ہے جو خطبات اقبال میں ظاہر کیے گیے ہیں- زیر نظر مضمون مذکورہ بالا مقالے کے ان حصوں پر مشتمل ہے، جو اقبال کے تصور اجتہاد یا اس سے متعلق مباحث کے بارے میں ہیں- "ساحل" کی مدیر کے بقول یہ سید سلیمان ندوی کے خلیفہ ڈاکٹر غلام محمد کے امالی ہیں، جو انہیں سید صاحب نے املا کرائے تھے- یہ امالی ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی وفات کے بعد شائع ہوئے اس لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ امالی اب تک کیوں شائع نہیں ہوسکے اور کیا ان میں رد وبدل کی گئی ہے اور کتنی؟ ان امالی میں اکثر مقامات پر جہول پایا جاتا ہے اور لگتا ہے کہ یہ سید صاحب کے خیالات نہیں ہوسکتے- ہم نے چند مقامات پر اس کی نشاندہی کردی ہے، تاہم چونکہ خطبات کے بارے میں برصغیر کے بعض دیگر علماء کی رائے بھی کم وبیش یہی ہے جو اس تحریر میں بیان ہوئی ہے- اسی افادیت کے پیش نظر ان امالی کو ماہنامہ "ساحل" کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے- اس سے قطع نظر کہ اس تحریر میں مذکور آراء سید سلیمان ندوی کی ہیں یا نہیں یہ تحریر اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے- اس میں علامہ اقبال کے خطبۂ اجتہاد میں مذکور مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے مراجع ومصادر پر بھی بہت قیمتی نقد موجود ہے- اختلاف رائے اسلامی تہذیب میں ایک عظیم روایت ہے- بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخالف رائے کو گمراہی، الحاد اور کفر کے پیمانوں سے ناپا جائے، اس طرح تنقید کی علمی وقعت باقی نہیں رہتی- مدیر

اسلام کی تشکیل نو کے لئے اقبال مرحوم نے یورپ کے فکر وفلسفے کے غیر جانبدارانہ وغیر جذباتی جائزے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ یورپ جن نتائج تک پہنچا ہے، وہ اسلام کے دینی فکر کی نظر ثانی اور تشکیل نو میں کہاں تک مدد دے سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی سراسر غلط ہے، اول تو دینی فکر پر نظر ثانی کا امکان ہی خارج از بحث ہے لیکن ہلاکت آفرینی یہ ہے کہ اسلام پر نظر ثانی اور اسلام کی تشکیل کے لئے معاونت ایک ملحد اور کافرانہ فکر وفلسفے سے درآمد کی جارہی ہے۔ اقبال مرحوم کا آخری خطبہ Is religion possible بہت مختصر ہے لیکن اسے پڑھ لیا جائے، تو ان کی تمام فکری لغزشیں [اور] مغرب سے مرعوبیت عیاں ہوجاتی ہے۔ نکلسن کے دیباچہ مثنوی اسرار خودی میں اقبال کے افکار اقبال مرحوم کے الفاظ میں پڑھ لئے جائیں تو اقبال مرحوم اور مغرب کے مابین گہری فکری فلسفیانہ ہم آہنگی واضح ہوجاتی ہے۔ اسرار خودی کا [یہ] دیباچہ بعد میں خارج کردیا گیا۔ [صفحہ ۳]

یہ دلچسپ بات ہے کہ تمام جدیدیت پسند کرامت علی سے مشرقی اور اقبال مرحوم تک سب اسلام کی اصلاح کے درپے ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں جو مغرب کی اصلاح چاہتا ہو، تمام عیب نقائص اسلام میں ملتے ہیں، مغرب ہر عیب سے خالی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کوئی مغرب کو بدلنا نہیں چاہتا، سب اسلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ ان میں سے کچھ عربی نہیں جانتے، کچھ اسلام کو نہیں جانتے، کچھ مغرب کو نہیں جانتے، سب ایک آنکھ والے ہیں لیکن صرف اسلام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام اور مغرب دو مختلف ادیان ہیں، مارماڈیوک پکتھال تو مغرب کو تہذیب ہی نہیں مانتے۔ وہ تو کہتے تھے کہ [یہ] بہیمیت ہے، یہ کتوں اور بلیوں کی تہذیب ہے اسے تہذیب نہیں کہا جاسکتا۔ مسلمانوں کا اصل انحطاط اور ذلت کی آخری حد یہی ہے کہ انہیں اپنے عروج کے لئے، اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لئے سہارا کہاں سے ملے گا۔ اللہ سے، اس کے رسول سے، اپنے نظریہ حیات سے نہیں بلکہ یورپ کے اصولوں سے، تجربیت سے، سائنس سے، عقلیت سے، معتزلہ سے، نطشے، برگساں کے سپرمین اور وجدان سے۔ یہ پستی کی انتہا ہے۔ اسی لئے علماء نے خطبات اقبال مرحوم کی شدید مخالفت کی، کفر کے فتوے بھی دیے گئے لیکن ہم اقبال مرحوم کی اہمیت وافادیت کو سمجھتے تھے، علماء نے کہا کہ خطبات پر نقد معارف میں آنا چاہیے، اس ہیچ مداں نے صرف زبانی اتنا کہا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا، اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اقبال مرحوم کی شاعری نے اس ملت کو تازہ خون پہنچایا بلکہ اس ملت کے بچھڑے ہوئے قافلے کو کمک پہنچائی، جب شاعری پڑھتے ہیں تو ایک آتش فشاں ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اقبال مرحوم کا دل دردمند ہے جو شعروں میں ملت کے زخموں کے لئے مرہم بن جاتا ہے۔ اقبال مرحوم کی شاعری اور نثر میں بڑا فرق ہے۔ ایک دل کا معاملہ ہے، دوسرا عقل کا۔ اسلامی تاریخ وتہذیب میں عقل کا مقام دل ہے، جب وہ دل کے مقام سے خطاب کرتے ہیں تو ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ملت اسلامیہ کے دل کی آواز بن جاتی ہے، لیکن

یہی آواز جب مغرب سے متاثر ہوکر عقل کے ذریعے نثر میں آتی ہے، تو ملت اسے مسترد کر دیتی ہے۔ علماء نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو قبول کر لیا کہ یہ ٹھیک تھا جو حصہ غلط تھا وہ غلط ہے لیکن نثر کو قدیم اور جدید طبقات نے مسترد کر دیا۔ البتہ مجھے نظر آتا ہے کہ مستقبل میں مغرب فکر اقبال مرحوم اور خطبات کو اسلامی معاشروں کو جدید بنانے کے لئے مضبوط آلے کے طور پر استعمال کرے گا۔ نکلسن نے اپنے مقدمے میں بلاوجہ نہیں لکھا:

> They involve a radical change in the Moslem mind and their real importance is not to be measured by the fact that such a change is unlikely to occur within a calculable time.

اقبال مرحوم نے اغنی دیس، پادری رجب علی اور پادری میلکم کے تصور کے برعکس مولوی چراغ علی کے فلسفے سے DYNAMISM کی اصطلاح لے کر کائنات اور اشیاء میں ابدی سکون کی نفی کی اور یہ نفی اس حد تک وسیع ہوئی کہ انہیں کائنات مسلسل تخلیقی میلان وسیلان سے بہرہ ور نظر آنے لگی اور ارتقاء در ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگی۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ خودی کی براقی و ادراکی اور تخلیقیت کی شان نہ انبیاء کو معلوم تھی نہ صحائف آسمانی میں ان کا ذکر ہے نہ سلف کے علم میں تھی نہ خلف کو ان کا پتہ ہے۔ یہ اقبال مرحوم کے ذہن و دماغ کی خوبصورت اپج ہے، مگر یہ اپج اسلامی علوم کی نفی کرتی ہے، خدا خود تخلیق ہو رہا ہے اور کائنات بھی مسلسل تخلیق ہو رہی ہے۔ [یہ] ایک ایسا تصور ہے جو مذاہب عالم کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، ان خود ساختہ تصورات کی بنیادیں جدید سائنس سے اقبال مرحوم کی والہانہ محبت میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اب سائنس کے مفروضات کی بنیاد پر ذات خداوندی اور اس کی برپا کردہ کائنات کے بارے میں اس آزادانہ تبصرے کی جرأت اسلامی تاریخ میں اقبال مرحوم کے حصے میں آئی۔

اقبال مرحوم کے پاس ان موضوعات کے سلسلے میں اہم ترین حوالہ وائٹ ہیڈ کا ہے، اس کے فکر کا اقبال مرحوم پر بہت اثر تھا لیکن کائنات کے ضمن میں اقبال مرحوم نے جن آیات کو استعمال کیا ہے وہ محل نظر ہیں، ان آیات کا انطباق ان مباحث پر ممکن ہی نہیں۔ خودی، دعاء، آزادی سے ہمکنار ہونا، اپنے تجربات سے خودی کی تشکیل جیسے مباحث تمام کے تمام مغربی فلسفے سے اقبال مرحوم نے مستعار لئے اور انہیں اپنے الفاظ میں اسلام کا پیرہن عطا کرنے کی کوشش کی۔

اقبال مرحوم اجتہاد مطلق کے مؤید تھے یعنی اس درجے کا اجتہاد جو ائمہ اربعہ کی سطح کا ہو یعنی مجتہد مخصوص فقہ کی سطح سے بلند ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے استنباط کرے، یہ خواہش بہت عمدہ ہے لیکن کیا اس درجے کا اجتہاد کرنے کے لئے اس درجے کی شخصیت، وہی تقویٰ، وہی للّٰہیت، وہی زہد ضروری نہیں ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب اجتہاد مطلق کے لئے مجتہد مطلق کا مغربی فکر و فلسفے، جدید سائنس اور یونانی فکر و فلسفے کو بخوبی جاننا ضروری ہے، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یونانی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتا ہو تا کہ کفر کی حقیقت اس کی اصل زبان میں پڑھ سکے۔ مجتہد کی یہ اضافی صفات عہد حاضر کے لئے ضروری ہیں لیکن اجتہاد کی بنیادی صفات وہی ہوں گی، جو امام نوویؒ، بیضاویؒ، غزالیؒ، بزدویؒ، شاطبیؒ اور صاحب تفسیر احمدیہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر ایسا کوئی مجتہد پیدا ہو جائے تو وہ ضرور اجتہاد کرے لیکن ترکی کے کمال مصطفیٰ اتاترک اور ترکی کی پارلیمنٹ جیسے کافرانہ، ملحدانہ اداروں سے اجتہاد کی توقع کرنا اقبال مرحوم کی فاش غلطی تھی۔ اقبال مرحوم نے نثر اور شاعری کے اشارات میں ان مجتہدین عصر پر لطیف طنز کیا ہے، جو علوم نقلیہ میں رسوخ اور رسوخ فی الدین کے بغیر اجتہاد کے علمبردار بن گئے ہیں۔ لیکن ان کی مذمت کرتے ہوئے اقبال مرحوم خود اپنے مقام کا جائزہ نہیں لیتے کہ کیا وہ ان مباحث کو برپا کرنے کے اہل تھے، عربی زبان سے واقفیت کے بغیر اور علوم اسلامی میں رسوخ کے بغیر ایک ایسے منصب پر فائز ہونے کی کوشش، جہاں سے وہ ملت اسلامیہ کی تشکیل نو کا فریضہ بھی سنبھال لیتے ہیں اور اجتہاد کا طریقہ کار بھی خود طے کر لیتے ہیں۔ اقبال مرحوم کو اجتہاد کے اس فساد کا [خود بھی] اندازہ تھا لہٰذا وہ اسرار خودی میں کہتے ہیں:

نقش بر دل معنی توحید کن
چارہ کار خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمان انحطاط
معنی تقلید ضبط ملت است

ان اشعار میں اقبال مرحوم نے عہد حاضر میں تقلید کو اجتہاد پر فوقیت دینے کا عندیہ دیا ہے، جب اقبال مرحوم کا عہد اجتہاد کے قابل نہ تھا تو آج کے عہد میں تو اجتہاد سے گریز اور تقلید پر اصرار بدرجہ اولیٰ افضل ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال مرحوم کی تائید تقلید ایک عارضی طریقہ اور احتیاطی راستہ ہے اور وہ اجتہاد کے زبردست مؤید تھے۔ مگر کیا عصر حاضر اس احتیاط کا مکلّف نہیں ہے۔ اجتہاد کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن شرائط اجتہاد پر اصرار ہے۔ اجتہاد کرنے کے لئے کم از کم مطلوبہ قابلیت تو پیدا کیجئے، اس کے بغیر صرف تمنا کا قدم اجتہاد کا راستہ آسان نہیں کر سکتا۔ اجتہاد کی بحث میں اقبال مرحوم یہ نکتہ فراموش کرتے ہیں کہ اجتہاد تو نویں صدی ہجری تک کسی نہ کسی شکل میں ہو رہا تھا، لیکن اجتہاد کے دور میں ہی تاتاریوں نے مسلمانوں پر غلبہ کیسے حاصل کر لیا، نہ تو وہ کوئی نظریہ حیات رکھتے تھے، نہ ان میں وہ حرکت، تغیر ارتقاء Dynamism تھا، جو کسی تہذیب و تمدن کے غلبے کے لئے بنیاد کا کام کرتا ہے، پھر یہی غلبہ اچانک ختم ہو جاتا ہے اور مسلمان دوبارہ غالب آ جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی کس اجتہادی قوت کے ذریعے پیدا ہوئی، یہاں تو تبدیلی کا عمل صرف دعوت کے ذریعے وقوع پذیر ہوا ہے، اگر مسلمان تاتاری غلبے سے اجتہاد کے بغیر نکل سکتے ہیں تو مغربی تہذیب کے غلبے سے نکلنے کے لئے صرف اور صرف اجتہاد پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ابن تیمیہؒ کی تحریک اجتہاد کی اہمیت اپنی جگہ، اس تحریک سے تاتاریوں کی شکست اور مسلمانوں کے غلبے کا کیا جواز مہیا کیا جا سکتا ہے۔ ابن تیمیہؒ کے کس

اجتہاد سے تاتاریوں کو شکست ہوئی اور کس اجتہاد نے مسلمانوں کو غلبہ دیا۔ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کو حرکت و ترقی کا مظہر قرار دینا بڑی عجیب بات ہے، یہ فکر تاریخ اسلام کے لئے اجنبی فکر ہے، اقبال مرحوم تقلید کے خلاف اٹھنے والی وہابی، بابی تحریکوں کو اسلام کے دور جدید میں زندگی کے نئے سرچشموں سے تشبیہہ دیتے ہیں لیکن ان سرچشموں نے عالم اسلام کی قسمت پر کیا اثر ڈالا۔ وہابی تحریک اجتہادی تحریک تھی؟ کیا یہ تحریک اجتہاد کے زور پر پھیلی؟ کیا اس تحریک کی مقبولیت اجتہادی روح کے باعث ہوئی یا اس تحریک نے جبر کے ذرائع پر انحصار نہیں کیا؟ تاریخ کا اس رخ سے جائزہ لیا جائے تو چونکانے والے حقائق منظر عام پر آئیں گے۔

اس دور کی تاریخ فراموش نہیں کی جاسکتی، خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزی استعمار نے آل سعود کو کس طرح استعمال کیا؟ یہ کیسی اجتہادی حرکت تھی جو طاقت اور جبر کی بنیاد پر اپنا دائرہ وسیع کر رہی تھی۔ اقبال مرحوم وہابی تحریک کے غلبہ کو اجتہاد کا غلبہ اور امت کے لئے نیک شگون تصور کرتے ہیں۔ یہ رویہ دراصل ان کی روحانیت کا نتیجہ ہے، جو ملت اسلامیہ کا عروج چاہتی ہے، خواہ یہ عروج جبراً ہو، جبکہ عروج جبر سے کیسے آسکتا ہے۔ صرف اجتہاد کے جوش میں تحریکوں کی تعریف و توصیف یک طرفہ نظریہ ہے جو اقبال مرحوم جیسے مفکر کے شایان نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ ترکی کی اصلاحات کو بھی اجتہاد کے احیاء کی نئی شکلیں قرار دیتے ہیں اور ان شکلوں کی بنیاد پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت اپنی اصل میں حرکت پذیر ہے اور اس حرکت کے لئے قوت نمو اسے خارج سے نہیں داخل سے فراہم ہوتی ہے، آج اقبال مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے ان مفروضوں کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، ان کی نظر سے کمال اتاترک کے کمالات نہیں گزرے، جب وہ آسمان کی طرف مُکا اٹھا کر اللہ تعالیٰ کو دکھاتا تھا اگر اسلام ایسے اجتہاد کے لئے آیا تھا تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ وہابی تحریک نے عصر حاضر کے تناظر میں کیا اجتہاد کیا ہے؟ ہم تو کم از کم اس سے لاعلم ہیں۔ عالمی اجتماع اسلامی کراچی میں منعقد ہوئی تھی، پوری دنیا سے تمام مکاتب فکر کے مسلم علماء فقہاء تشریف لائے تھے، کئی روز تک ان سے تبادلہ خیال ہوتا رہا، سب کا خیال یہی تھا کہ مغربی فکر و فلسفے اور جدید سائنس کو سمجھے بغیر اجتہاد الحاد کا راستہ کشادہ کرے گا، ہر دردمند عالم خواہ کسی مکتب فکر سے ہو، اپنے ملک کی صورت حال سے مایوس تھا اور ہمارے شاعر مشرق بابی، (وہابی) ترک، اجتہاد میں امیدوں کا جہاں آباد کر رہے تھے۔

قدیم علماء نے اجتہاد کے لئے جو شرائط طے کیں، وہ اقبال مرحوم کو عصر حاضر کے فرد میں نظر نہ آئیں، تو انہوں نے اجتماعی اجتہاد اسمبلی کے ذریعے کرنے کا اجتہاد فرمایا، جب شرائط اجتہاد فرد میں نہیں پائی گئیں تو اسمبلی میں کیسے اکٹھے ہوسکتی ہیں، سو صفر اکٹھے ہو کر ایک کیسے بن سکتے ہیں، اسمبلیوں کے انتخابات کا تماشہ ہندوستان میں بہت دیکھا جا چکا، یہ اسمبلیاں کیسے اجتہاد کر سکتی ہیں؟ اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے، تمام انسان برابر ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہند میں صرف ٹیکس دینے والے ووٹ دے سکتے تھے، وہ زمانہ بھی ختم ہو گیا، ہم پاکستان کی اسمبلی کو اجتہاد کے قابل نہیں سمجھتے، اس کے اراکین کا دینی علوم سے کیا تعلق۔ ایک آدھ استثنیٰ چھوڑ دیجئے۔ اب علامہ اقبال مرحوم اور ایک بقال کا ووٹ برابر ہے اور دونوں یکساں طور پر جمہوری عمل کے ذریعے اسمبلی کے ممبر بن سکتے ہیں، اب بقال، حمال، حجام اور موچی اجتہاد کریں گے، اقبال مرحوم کا یہ نقطہ نظر ان کی سطحیت کو واضح کرتا ہے، اس سطحیت کا احساس انہیں آہستہ آہستہ ہوتا گیا کیونکہ شروع میں خطبات پر علی گڑھ میں بہت داد ملی اور ہندوستان کے پڑھے لکھے جو مغرب سے مرعوب تھے، انہیں اقبال مرحوم کے ذریعے اسلام کی فصیل میں نقب لگانے کا زبردست طریقہ مل گیا تھا لیکن جب گرد بیٹھ گئی تو حقیقت بھی کھل گئی۔ بعد میں اقبال مرحوم ہندوستان کے ان پڑھے لکھوں سے بہت متنفر ہوئے اور ان سے مکمل مایوس ہو گئے بلکہ کہتے تھے کہ اگر میں آمر ہوتا تو ان کو ہلاک کر دیتا۔

اقبال مرحوم مغرب کے Feminism سے شدید متاثر تھے [ایک مضمون میں انہوں نے لکھا تھا کہ تعدد ازدواج اس عہد کی سیاسی اقتصادی ضرورتوں سے مشروط تھا اور فی زمانہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جو علماء تعدد ازدواج کی اجازت دیتے ہیں، وہ امرائے قوم کو زنا کا شرعی بہانہ مہیا کرتے ہیں''] یہ جسارت مغربی فکر و فلسفے کا نتیجہ اور علوم اسلامی سے عدم واقفیت کے باعث تھی لیکن آخر زمانے میں اقبال مرحوم نے

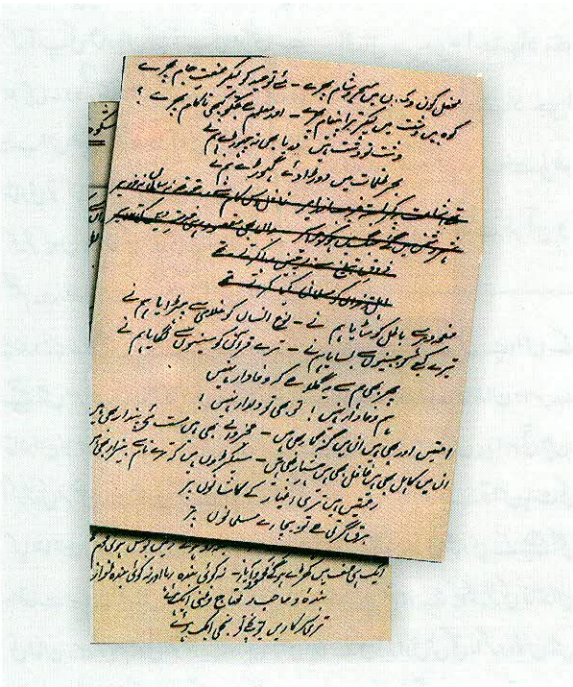

مغرب کی فحاشی عریانی، بے حیائی دیکھی تو مجھے لکھا تھا کہ اسلام کے تعدد ازدواج کے اصول کی اصل حقیقت تو مجھ پر واضح ہوئی ہے، اگر [آج] شارع علیہ السلام ہوتا تو چار کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ عقل اور اجتہاد جب اصول دین بن جائیں تو اسی قسم کی افراط و تفریط لازمی ہے، پہلے دوسری کے بھی قائل نہ تھے اب پانچویں کے بھی قائل ہو گئے، اسی لئے تقلید اجتہاد سے بہتر ہے اور اگر اجتہاد کرنا ہے تو ان تمام شرائط کا ہونا لازمی ہے، جو علماء نے بیان کی ہیں۔ بعد میں اقبال مرحوم نے عورتوں کے حدود کار، حجاب، تقسیم کار پر وہی موقف اختیار کر لیا تھا جس پر اجماع امت ہے۔

فقہ اسلامی میں طلاق کے مسئلے کی تاریخی تحقیق سے بھی اقبال مرحوم گہری واقفیت نہ رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے وکالت کے پیشے میں جب طلاق کے مقدمات کثرت سے دیکھے تو اس ضمن میں فقہی احکامات سے متنفر ہو گئے۔ احکام کی علت اور روح سمجھے بغیر محض چند واقعات و حادثات سے مضطرب ہو جانا دین کا مزاج نہیں ہے، عورت طلاق لیتی ہے مرد طلاق دیتا ہے۔ یہ فقہ کا اصول نہیں قرآن کا حکم ہے، اقبال مرحوم کو اعتراض تھا کہ نکاح کے معاہدے میں دونوں فریقوں کو برابر کے حقوق حاصل نہیں، طلاق دینا حق نہیں ایک ضرورت ہے اور ایسی ضرورت جو انتہائی ناگزیر حالات میں زیر عمل آتی ہے۔ اقبال مرحوم حق اور ضرورت میں فرق نہیں کر سکے کیونکہ اس باریک فرق کو سمجھنے کے لئے فقیہانہ نظر ضروری ہے، ایک بار انہوں نے مجھ سے شکوہ کیا تھا کہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمان لڑکیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے خصوصاً حنفی فقہ ولی کی شرط عائد کرتی ہے، یہ قرآن کے نصوص کے خلاف ہے، میں نے سوال کیا کہ اس سوال پر تو ہم بعد میں بات کریں گے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو ولی کے بغیر نکاح کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں، پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے معاشرے میں لڑکوں کو اپنی پسند سے شادی کرنے کی اجازت ہے یا نہیں، وہ چپ ہو گئے۔ میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ کی شادیاں کیا آپ کی مرضی سے ہوئیں۔ وہ غمگین ہو گئے میں نے عرض کیا جب اس عہد کا اتنا بڑا آدمی اپنی پسند سے شادی تو کیا طلاق بھی نہیں دے سکتا تو یہ کہنا کہ لڑکیوں کو پسند کی شادی کی اجازت نہ دینا ظلم ہے، خلط مبحث ہے، مسئلہ لڑکی یا لڑکے کی پسند و ناپسند کا نہیں، شادی انفرادی معاملہ نہیں ہے، یہ ایک اجتماعی عمل ہے، اس کے نتیجے میں صرف ایک لڑکا لڑکی بندھن میں نہیں بندھتے بلکہ ایک خاندان دوسرے خاندان کا حصہ بنتا ہے۔ رشتوں سے تعلقات کی سینکڑوں نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، اگر لڑکی کی مرضی سے شادی کرے اور خاندان کی امان سے محروم ہو جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکا اس سے ہمیشہ عمدہ برتاؤ کرے گا، پسند کی شادی کے جتنے بھی واقعات میرے علم میں ہیں، ان میں اسی فیصد طلاق پر ختم ہوئے کیونکہ لڑکی خاندان کی امان سے محروم ہوئی، تو لڑکے کو اپنی مرضی چلانے کی آزادی مل گئی، اگر دونوں میں اختلاف ہو گیا تو لڑکی تنہا رہ گئی، ایسا بھی ہوا ہے کہ نہ لڑکی کے گھر والے راضی تھے نہ لڑکے کے گھر والے، دونوں خاندان کی امان سے محروم ہوئے۔ حوادث کا شکار ہوئے، معاشی بدحالی میں مبتلا ہوئے یا معاشرتی طور پر تنہا ہو گئے، اس مصیبت میں بعض جگہ دہری مصیبت یہ آئی کہ دونوں میں اختلافات ہو گئے، بچے برباد ہوئے، ان کا کوئی والی تھا نہ ولی، فقہاء دین کے احکامات باریک بینی سے اخذ کرتے ہیں، عام آدمی ان کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا، اقبال مرحوم نے ایک فتوے پر اعتراض کیا کہ اگر لڑکی نیچے رہتی ہے اور ماں باپ گھر کے اوپر رہتے ہیں، لڑکا بیوی کو ملاقات سے منع کر دے تو لڑکی پر تعمیل حکم واجب کیوں ہے؟ ایک قریبی عزیز کا واقعہ ہے کہ لڑکی کے والدین نہایت بدمزاج جھگڑالو قسم کے تھے لیکن بیمار بھی، لہٰذا داماد نے انہیں ساتھ تو رکھا لیکن لڑکی کو ممانعت کر دی، فتوے کی مصلحت فقیہ سمجھ سکتا ہے عامی نہیں، اسلام میں رشتہ نکاح کو ہر حال میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ شوہر کی اطاعت کا حکم بلاوجہ نہیں دیا گیا ہے، احکام اور فتاویٰ کی مصلحتیں باریک بین نگاہیں سمجھ سکتی ہیں۔ فقہی احکام بہت گہری مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، جنہیں مغربی ذہن اور مستشرقین کی تحقیق نہیں سمجھ سکتی۔

جہاں تک پنجاب کے ان مقدمات کا تعلق ہے کہ خاوند ظالم ہے بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خاندانی نظام ختم ہو گیا ہے، معاشرت تباہ ہو گئی ہے، یورپ کی طرح ہر شخص آزاد ہے، جو چاہے کرتا پھرے، ہمیں اپنی معاشرت اور اپنے خاندان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ شریعت اور فقہ کی اصلاح کی جائے، اصل معاملے تک پہنچے بغیر ہم فرع پر رک جاتے ہیں، فقہ اسلامی پر اقبال مرحوم کی نظر بہت سطحی تھی۔

اقبال مرحوم کو پنجاب میں ارتداد کے ذریعے تنسیخ نکاح کے مقدمات کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا، بجائے اس کے کہ وہ پنجاب کی مقامی معاشرت، عادات، رسوم و رواج پر غور کرتے تاکہ اتنے بڑے پیمانے پر تنسیخ نکاح کے مقدمات کی توجیہہ کر سکتے، انہوں نے اسلامی فقہ اور حنفی فقہ میں خامیوں کی تلاش شروع کر دی، وہ جزئیات کو لے کر کلیات اخذ کرنے کا ذہن رکھتے تھے اسے ہم جدید اصطلاح میں سائنٹیفک ذہن کہہ سکتے ہیں، اس سائنٹیفک ذہن کا اطلاق سائنس پر کیا جا سکتا ہے، فقہ میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا، عالم اسلام کی آبادی تقریباً پچاس کروڑ ہے شادی شدہ عورتوں کی تعداد بھی کم از کم دس کروڑ ہو گی اگر دس کروڑ عورتوں سے پنجاب میں دو سو عورتوں نے ارتداد کے ذریعے تنسیخ کا راستہ دیکھا، تو اس سے فقہ اسلامی کی کمزوری نہیں بلکہ پنجابی معاشرے کی خامیاں سامنے آتی ہیں*، جو مسلمان تو ہو گئے لیکن عہد جاہلیت کے رسوم و رواج کے دائرے سے نہیں نکل سکے، کیونکہ ہمارے یہاں نومسلموں کی تربیت کا کوئی نظام نہیں رہا لہٰذا ہماری معاشرت قدیم رسومات سے باہر نہیں نکل سکی، ہندوستان میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ پنجاب میں خاص طور پر اپنی ذاتوں، برادریوں پر فخر کیا جاتا ہے، جزو سے کل تشکیل دینے کا یہ مزاج اقبال مرحوم کے ہاں غالب ہے، جس سے بڑے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اقبال مرحوم نے پنجاب کو عالم اسلام کے مساوی سمجھا اور پنجاب کے چند خاص علاقوں کی خاص برادریوں کے سماجی و معاشرتی رویوں [اور] کمزوریوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل فقہ اسلامی میں موجود نہ پا کر فقہ اسلامی کے ذخیرے کو مسترد کر دیا۔ نئے مسائل کے لئے استنباط کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی شرط یہ ہے کہ اسلامی احکامات اسلامی معاشرے، اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن سے پیوستہ ہیں۔ آپ معاشرت، تہذیب، تمدن، غیر اسلامی رکھیں اور اس میں فقہ اسلامی پر عمل

> اقبال مرحوم اجتہاد مطلق کے مؤید تھے یعنی اس درجے کا اجتہاد جو ائمہ اربعہ کی سطح کا ہو یعنی مجتہد مخصوص فقہ کی سطح سے بلند ہو کر براہ راست قرآن و سنت سے استنباط کرے۔

ناممکن سمجھ کر فقہ کو مسترد کر دیں۔ یہ غلط رویہ ہے، تشنیع فاحشہ کے احکامات میں سختی کیوں ہے؟ چار گواہوں کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ مذاق اڑانے کے لئے کہہ دیجئے، اس طرح تو کبھی کسی زانی کو سزا نہیں ملے گی تو کیا اسلام صرف سزائیں دینے کے لئے آیا ہے، جب بے حیائی اس درجہ پر پہنچ جائے اور گواہ بھی نہ ہوں تو درگزر کر کے غلاظت کو مستور رہنے دیا جائے۔ اب اس بنیاد پر یہ الزام کہ اسلامی قانون ناقص ہے، [دراصل] ہماری عقل کے ناقص ہونے کا مسئلہ ہے۔ جدیدیت پسندوں کا یہ طرز عمل صرف عقل پر انحصار کرنے کا نتیجہ ہے یہ عقل کو ذریعہ علم سمجھنے کے بجائے مأخذ علم سمجھتے ہیں اور عقل خود ان کی اپنی ہوتی ہے لہٰذا اصلاً دین کا مأخذ ان کا ذہن ہوتا ہے، اسی سے وہ فیصلے کرتے ہیں کس قدر شرم کی بات ہے کہ جن شوہروں کے مظالم کے باعث یہ عورتیں عیسائی ہوئیں، ان شوہروں کی اصلاح، زجر و توبیخ اور معاشرتی مقاطعہ کے لئے پنجاب بھر میں کوئی تحریک نہیں چلائی گئی اور سارے الزامات فقہ حنفی پر ڈال دیئے، یہ بات بھی ان کے پیش نظر نہ رہی کہ مجبوری کے عالم میں کہا گیا کلمہ کفر ہوتا ہے اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں اقبال مرحوم کا خیال تھا کہ ایک فقہی حکم سے عورتوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ پنجاب کا قدیم معاشرتی نظام عیسائیت کے فروغ کا سبب بن رہا تھا، جس کی اصلاح کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی، یہ وہی صورت حال ہے جس کے بارے میں قرآن نے بدوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم اسلام لے آئے ہو لیکن یہ تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اہل پنجاب کا فریضہ تھا کہ وہ مل بیٹھ کر ان ظالم شوہروں سے عورتوں کی گلوخلاصی کراتے۔ یہ اعتراض اسی قسم کا ہے کہ یتیم پوتے کو میراث میں شریعت کوئی حصہ نہیں دیتی اور دادا میراث کا مالک بن جاتا ہے۔ کیا قرآن نے دادا کو اپنی زندگی میں پوتے کو مال دینے کی ممانعت کی؟ کیا میراث میں بھی وصیت کی ممانعت ہے؟ دادا چاہے تو اپنی زندگی میں جس قدر مال پوتے کے لئے ہبہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، آخر موت تک توقف کی کیا ضرورت ہے؟ دادا پر کوئی تنقید نہیں کر رہا۔ ساری تنقید اسلام کے قانون میراث پر ہو رہی ہے۔ دادا زندگی میں مال دینے سے کیوں گریزاں تھے، اب وصال کے بعد تو قانون میراث پر عمل ہوگا۔ یہ مسئلہ تو ہندوستان و پاکستان میں عام ہے کہ ماں یا باپ نے زندگی میں مکان ایک بیٹے کے نام کر دیا، وصیت کر دی یا اعلان کر دیا۔ مختلف وجوہات کے تحت مثلاً بیٹا اچھا خادم ہے یا مکان کی تعمیر میں سب سے زیادہ روپیہ اس بیٹے نے لگایا یا غریب ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن کاغذات میں نام تبدیل نہیں ہوا۔ خطرہ یہ ہے کہ اگر بیٹے نے خدمت نہ کی تو مکان سے بھی جائیں گے، انتقال کے بعد ایسی جائیداد تمام ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک ملکیت اور قبضہ منتقل نہ ہو جائیداد میں سب ورثاء کا حصہ رہتا ہے۔ اب شریعت پر اعتراض کیا جا رہا ہے کہ متوفی کی وصیت تھی، کاغذ موجود ہے اور شریعت اس وصیت کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ شریعت آپ کی خواہش نفس کی تسکین کے لئے نہیں آئی اپنے نفس کو شریعت کے سامنے جھکا دیجئے یہی دین ہے، ہر بات پر اعتراض ہر مسئلے میں عقلی دلیل سے شریعت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ دادا نے موت تک توقف کیوں کیا؟ اگر پوتے سے محبت تھی تو زندگی میں مال سپرد کرتے۔ اگر بہو پر اعتماد نہ تھا تو کسی کو سرپرست مقرر کرتے۔

مغرب سے مغلوبیت نے اقبال مرحوم کو یہ باطل خیال پیش کرنے پر مجبور کیا کہ اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے، جمہور اور اجماع کی اصطلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ نئے مسائل پیش آنے پر جمہوری طریقے سے لوگوں کی رائے لے کر [ریفرنڈم وغیرہ] قانون وضع کر لیا جائے گا اور غالباً اسمبلی ان کی نظر میں اجماع اور جمہور کا متبادل تھا فقہ اسلامی میں جمہور سے کیا عوام الناس مراد ہیں، اقبال مرحوم اس اصول سے تو آگاہ ہوں گے لیکن اس کی تفہیم انہوں نے مغربی منہاج میں کی تو یہ گمراہی خود بخود پیدا ہو گئی اور اقبال مرحوم کے یہاں ایسی بے شمار گمراہیاں ملیں گی۔ اقبال مرحوم نے یہ اجتہاد بھی فرمایا کہ ''اسلام کے اصولوں کی بنیاد مطلق آزادی اور مساوات پر قائم ہے، کسی کو دوسرے پر قانونی یا دینی برتری حاصل نہیں سیاست اسلامی کا بنیادی اصول انتخاب ہے، جو خلافت کو جمہوریت کی شکل دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس اصول کی صراحت کی گئی ہے''۔ اقبال مرحوم کے یہ تمام اجتہادات مغربی فکر و فلسفے کی پیداوار ہیں۔ ان اجتہادات سے اسلامی تاریخ و تہذیب کا دامن خالی ہے۔ جمہوریت ایک خالص مغربی اصطلاح ہے لہٰذا اسے اسلامی تاریخ و تہذیب اور فقہ میں ڈھونڈنا درست نہیں ہے، جمہوری اداروں کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنا اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، قرآن کریم میں ملوکیت کی مذمت اور جمہوریت کی مدحت کہاں ہے؟ انبیاء کی اولاد ان کے بعد ملوک بنی تو ملوکیت قرآن سے ثابت ہے، اسے قابل نفرت قرار دینے کی شرعی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ جمہور کو جمہوریت اور جمہوری عمل قرار دینا اسلامی فقہ سے ناواقفیت ہے،

> اسلام اور آزادی دو متضاد نظریات ہیں،
> اسلام تو اللہ کی غلامی کا نام ہے،
> دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں انسان یا تو اللہ
> کا غلام ہے یا شیطان کا۔

آزادی اور مساوات کو اسلام میں ڈھونڈنا اسلام سے ناواقفیت ہے، یہ تو مغرب کے مسائل ہیں، ہماری کونیات Cosmology میں ماں باپ کے برابر نہیں ہو سکتی۔ بیٹا باپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر خدا کے برابر نہیں ہو سکتا، تابعی صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا، عمرؓ ابوبکرؓ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ عشرہ مبشرہ اور سابقون الاولون کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا۔ فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ متقی، عابد، زاہد، فاسق فاجر کے برابر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مساوات کا اصول تو اسلام میں ممکن ہی نہیں یہ خالص کافرانہ اصطلاح ہے، مساوات صرف ان معنوں میں ہے کہ سب اللہ کے عبد ہیں خواہ وہ عابد ہوں یا زناکار لیکن اسلامی معاشرے میں زناکار کی گواہی قبول نہیں ہوگی اور اسے کوئی اہم منصب نہیں دیا جائے گا اور کوڑے مارے جائیں گے، رجم بھی کر دیا جائے گا اور جلاوطن بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور آزادی دو متضاد نظریات ہیں، اسلام تو اللہ کی غلامی کا نام ہے، دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں انسان یا تو اللہ کا غلام ہے یا شیطان کا لہٰذا آزادی کا فلسفہ تو

خالص مغربی فلسفہ ہے۔

حنفی مکتب فکر پر اقبال مرحوم کا اعتراض کہ زندگی کی تخلیقی آزادی اور اس کے عدم تعین سے سہو نظر کر کے منطقی طور پر ایک کامل فقہی نظام کو احناف نے عقل محض کی بنیاد پر استوار کیا، فقہ اسلامی اور فقہ حنفی سے اقبال مرحوم کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ اقبال مرحوم حنفی فقہ اور فقہاء کو عبداللہ ابن وہاب افغانی، ترکی شاعر غالب پاشا** جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے، یہی وجہ ہے کہ ماجد صاحب [مولانا عبدالماجد دریابادی] نے انہیں درست مشورہ دیا تھا کہ یہ آپ کا دائرہ فکر نہیں ہے اس سے احتراز کیجئے۔

حجازی فقہاء کی جانب سے نسلی امتیاز کی بنیاد پر عراقی فقہاء کے خلاف شدید احتجاج کا ذکر خطبات میں آیا ہے۔ یہ خالص مستشرقین کے خیالات ہیں اور اقبال مرحوم نے میکس ہیورٹن کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ اسلامی فقہ کے ذخیرہ پر نقد کرتے ہوئے انہیں اندرونی تنقید کے بجائے بیرونی عناصر یعنی مستشرقین کی تنقید بلکہ تضحیک اور توہین پر اعتماد کرنا پڑا جب کہ مستشرقین کون تھے؟ ان کے سیاسی مقاصد کیا تھے؟ یہ بات عیاں ہے، اقبال مرحوم کا فقہ اسلامی پر نقد مستشرقین کے زیر اثر بہت

> ترکی کے کمال مصطفی اتاترک اور ترکی کی پارلیمنٹ جیسے کافرانہ، ملحدانہ اداروں سے اجتہاد کی توقع کرنا اقبال مرحوم کی فاش غلطی تھی۔

پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اور اکثر مقامات پر وہ انہی کی بات اپنے نام سے کرتے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ مالکی شافعی فقہاء حقیقت پسند تھے، جب کہ حنفی فقہ تخیلاتی اور کلامی مباحث کا مجموعہ ہے، نہایت غیر علمی اور نہایت سطحی بات ہے اصلاً وہ فقہ اسلامی کے قیمتی ذخیرے سے ناواقف تھے، ان پر ان کی گہری نظر نہ تھی، چند اہم مشہور کتابیں انہوں نے مترجم کے ذریعے پڑھ ڈالیں اور اس کمزور مطالعے کے بل پر لامحدود دعوے کر دیے، اس میں ان کا اخلاص موجود ہے لیکن اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ اقبال مرحوم اس بات سے بھی واقف نہ تھے کہ یونانی منطق حنفی اور مالکیوں سے پہلے شافعی فقہاء کے یہاں اہم قرار پاتی ہے اور المستصفٰی میں اسے اصول فقہ کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ان بنیادی مباحث سے ناواقفیت کے باوجود وہ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید جیسے موضوعات پر گفتگو کرنے کی جرأت کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص پر مبنی غیر علمی تبصروں کو اسی وقت قبول کیا جا سکتا ہے، جب ہم اپنے تخیل کی حدود کو لامتناہی کر دیں۔

فقہ احناف پر اقبال مرحوم کے تبصرے اس قدر سطحی ہیں کہ انہیں پڑھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اقبال مرحوم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مختلف متحارب مکاتب فکر اور گروہوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے تھے اور اس خط و کتابت سے حاصل شدہ معلومات کے تبادلے سے کچھ مفروضات قائم کر کے اپنی ذہانت سے بعض غیر معمولی نتائج اخذ کر لیتے، ان میں وہ علمی اہلیت نہیں تھی کہ ان نکات کی تائید و تصدیق متعلقہ کتب سے براہ راست کر سکتے، وہ علم کے بجائے تعقلی وجدان کے سہارے دین پر نقد کرتے تھے۔ لہٰذا ہر محقق و مفکر نے اپنے حساب سے اخذ شدہ ادھوری، جانبدارانہ معلومات انہیں مہیا کر دیں۔ انہی معلومات پر انہوں نے اسلامی علوم پر نقد فرمایا ہے۔ احمد دین امرتسری کے مکتب فکر سے بھی ان کے مراسم اور خط و کتابت تھی۔ امت مسلمہ کے علامہ عرشی اور صوفی تبسم ان سے مستقل رابطے میں رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ احمد دین صاحب کی اقبال مرحوم سے ملاقات ہو جائے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حنفیوں کے خلاف یہ جارحیت وہاں سے ملی ہو کیونکہ احمد دین امرتسری صاحب اہل حدیث تھے، تاریخی طور پر ذخیرہ فقہ میں مالکی اور حنفی مذاہب فقہ دوسرے مذاہب فقہ پر برتری رکھتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے ان مباحث میں امام داؤدؒ ظاہری کا ذکر نہیں کیا، جو امام شافعیؒ کے مقلد تھے اور آخر کار قیاس کا انکار کر بیٹھے، جب کہ اقبال مرحوم قیاس کو زندگی کا منبع کہتے ہیں۔ قیاس کا یہ انکار فقہاء حجاز کے پیروکار کی طرف سے کیا گیا تھا۔ احناف کی طرف سے نہیں، اقبال مرحوم نے قیاس کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اجتہاد کو اسی پر منحصر کر دیا ہے، جو غلط اصول ہے۔ قیاس محض ایک طریقہ ہے، اجتہاد قرآن و سنت اور مقاصد شریعت میں محصور ہے، ان اصولوں، حکمتوں، مقاصد، تغیرات کی بازیافت، ان کا اطلاق، حالات و زمانہ کی رعایت سب اجتہاد کے ہمہ گیر عمل کا حصہ ہیں۔

اقبال مرحوم نے فقہ حنفی پر اعتراض کرتے ہوئے قیاس پر نقد کیا ہے اور اسے ظنی عقلی استدلال کہہ کر ارسطو کی منطق سے جوڑ دیا ہے جبکہ حنفی فقہ کے تشکیلی زمانے میں یونانی منطق کا استعمال کبھی نہیں کیا گیا، یونانی منطق سے استدلال بہت بعد کے زمانے میں ہوا لیکن اقبال مرحوم کو یہ بنیادی بات بھی معلوم نہ تھی کہ احناف کے فقہی قیاس اور یونانی منطق میں کوئی مطابقت نہیں، اقبال مرحوم فقہ پر منطق یونانی کے اثرات کی تاریخ سے بھی لاعلم تھے ورنہ یہ اعتراض وارد نہ کرتے۔

اقبال مرحوم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حدیث سے استدلال کا طریقہ استخراجی ہے یا استقرائی، جب کہ وہ احناف پر طنز کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہتے تھے کہ حجازی اور عراقی سامی اور آریائی سوچ رکھتے ہیں لہٰذا حجازی استقرائی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور عراقی استخراجی طریقے کے قائل ہیں ممکن ہے کسی مستشرق نے حسب عادت کسی کتاب میں یہ جھوٹ گھڑا ہو اور اقبال مرحوم کو یہ جملہ پسند آ گیا ہو، سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر پر جمود، تقلید، ٹھہراؤ، یونانی منطق سے مرعوبیت کے بے بنیاد الزامات عائد کرنے کے باوجود خطبات میں تسلیم کر لیتے ہیں کہ دوسرے مکتب کے مقابلے میں حنفی مکتب تخلیقی اکتساب کی بہت زیادہ قوت رکھتا ہے، اگر حنفی جامد مقلد اور یونانی منطقی تھے تو پھر تخلیق کا سوتا ان کے مکتب فکر سے کیسے پھوٹ گیا، اقبال مرحوم کے یہاں اس طرح کے تضادات بے شمار ہیں کیونکہ بیشتر آراء ان کے مطالعے کا حاصل نہیں ہیں، بلکہ ادھر سے ادھر استفادہ کر کے اپنے نام سے دین کی تشکیل کا دعویٰ کر دیا گیا ہے جو تضادات سے پر ہے۔ اسی لئے یہ دعویٰ کبھی قبولیت حاصل نہ کر سکا۔

دینی علوم سے کامل بے خبری اور اسلامی فقہ کے عظیم الشان ذخیرے اور علم التفسیر اور علم الحدیث کے اصولوں سے عدم واقفیت کے باعث اقبال مرحوم کے یہاں گمراہیوں کا ایک طویل سلسلہ در آتا ہے، معارف میں عموماً ان گمراہیوں پر سکوت کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال مرحوم کی ذات سے اور ان کے شاعرانہ کمالات سے ملت کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو مولانا ماجد تو اس معاملہ میں بہت غیرت مند تھے اور چاہتے تھے کہ اقبال مرحوم کے کفر کے خلاف جو کچھ لاوا ان کے دل میں ہے کتابی صورت میں تحریر کر دیں لیکن ان کو قائل کرنا پڑا کہ صبر سے کام لیں۔ اقبال مرحوم ملت کا اثاثہ ہیں، ان کی شاعری نے زخموں کی رفوگری کی کہیں ملت سے اس کا روحانی سہارا چھن نہ پائے بلکہ انہیں آمادہ کیا کہ وہ تحریریں بھی شائع نہ کریں، جو اقبال مرحوم کے نام جارحانہ لب و لہجے میں لکھی گئی تھیں۔ ماجد صاحب نے ان کے الحاد و کفر کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے انہیں متنبہ کیا تھا کہ وہ اس دریا کو پایاب نہ کریں۔ ماجد صاحب اقبال مرحوم کے مداح تھے لہٰذا وہ قائل ہوئے، اقبال مرحوم کے انتقال کے بعد بھی ماجد صاحب نے احتیاط کو ملحوظ رکھا البتہ اپنے شذرات میں کبھی کبھی خطبات اقبال مرحوم کی گمراہیوں کے بارے میں دلچسپ اشارے کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان اشاروں کو مرتب کر لیا جائے تو خطبات پر ماجد صاحب کا نقد سلیقے سے مرتب ہو سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے ان سے استفسار کیا کہ کیا خطبات کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ اب کیا ہوگا تو ماجد صاحب نے تیکھے انداز میں صدق میں جواب دیا تھا کہ اقبال مرحوم [اور] سرسید جب یورپ کے سامنے اسلام پیش کرتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی بات بھی زبان سے ایسی نہ نکل جائے جو یورپ کو ناگوار ہو۔ خطبات اگر ترجمہ ہو گئے تب بھی اس کے فروغ کا دائرہ بہت محدود رہے گا اور یہ فتنہ کبھی پھیل نہ سکے گا۔ مولانا دریا آبادی کا یہ اعتماد کتنا درست تھا؟ خطبات کو میں فتنہ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ اقبال مرحوم نے ان مباحث سے رجوع کر لیا تھا اور نظر ثانی کر رہے تھے، انہیں اس کا موقع نہ ملا [ساحل، جون ۲۰۰۶ء، صفحات ۴۹-۵۹]۔

اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا اصل ماٴخذ تو اسلام اور عہد خلافت راشدہ ہے۔ جمہوریت کی بنیادیں اس زریں عہد میں تھی، امیہ اور عباسی اس میں رکاوٹ بن گئے، اب مغرب میں جمہوریت، پارلیمنٹ کا ظہور ہماری ہی روایت کا ظہور ہے لہٰذا جمہوریت کا خالق مغرب نہیں اسلام ہے۔ یہ بھی بے بنیاد دعویٰ ہے۔

جمہوریت اور اور جمہوری عمل کا اسلام سے کیا تعلق اور خلافت اسلامی سے کیا تعلق؟ موجودہ جمہوریت تو سترہویں صدی کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ یونان کی جمہوریت بھی موجودہ جمہوریت سے الگ تھی لہٰذا اسلامی جمہوریت ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ شورائیت کہہ سکتے ہیں، قرآن بتاتا ہے کہ فرعون کی بھی شوریٰ تھی اور ملکہ سباء کی بھی شوریٰ تھی جب حضرت سلیمانؑ کا خط ملا تو سباء نے اپنی شوریٰ سے مشورہ کیا جب حضرت موسیٰ نے فرعون کو للکارا تو اس نے بھی شوریٰ سے مشورہ کیا اور اس کی شوریٰ کے ایک رکن نے حضرت کے حق میں بہت کلمات خیر کہے اور فرعون کو انتباہ کیا تو شورائیت، نظام استبداد اور آمریت میں بھی رہتی ہے، ملوکیت میں بھی ہوتی ہے اور خلافت میں بھی ملتی ہے۔ مغرب کا یہ تصور کہ ملوکیت، خلافت، آمریت میں کوئی مشورہ نہیں کیا جاتا تھا، فرد واحد حکومت کرتا تھا، محض فریب نظر ہے، جمہوریت میں بھی اصل اقتدار کیا عوامی نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بھی محض فریب نظر ہے، اصل اقتدار تو ان لوگوں کے پاس ہوتا ہے جو پارلیمنٹ میں موجود نہیں ہوتے، یہ اقتدار تو نوکر شاہی کے پاس ہے۔ تمام قوانین وہی تیار کرتے ہیں، جمہوری نمائندے ان پر صرف دستخط کرتے ہیں اکثر کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مسودے پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ اسلام اور خلافت کا نظام خالصتاً جمہوری ہے، تاریخ اسلام کے لیے اجنبی تصور ہے۔

اب دیکھیے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان پہلے کیا گیا بیعت بعد میں ہوئی۔ خلیفہ تو انہیں مقرر کر دیا گیا اس تقرری کا فیصلہ عوام نے نہیں ارباب حل وعقد نے کیا۔ یہ کون لوگ تھے؟ کیا یہ منتخب ہوئے تھے؟ کیا رسول اللہ نے انہیں خلافت کے فیصلے کا اختیار دیا تھا؟ عہد رسالت میں یہی لوگ رسالت مآب کے قریب تھے، لہٰذا یہی فطری قائدین تھے ان کو جمہور سے توثیق وتصدیق کی ضرورت نہ تھی ان کی حیثیت مسلمہ تھی

> جمہوریت ایک خالص مغربی اصطلاح ہے لہٰذا اسے اسلامی تاریخ و تہذیب اور فقہ میں ڈھونڈنا درست نہیں ہے، جمہوری اداروں کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنا اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

جس طرح اہل عرب اپنی اولاد کو پہچانتے تھے، اسی طرح ان لوگوں کی اہمیت، حیثیت سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ ہر کہ ومہ کو خلافت کے فیصلے میں نہ شریک کیا جا سکتا تھا نہ شریک کرنے کی ضرورت تھی۔ اتنے اہم منصب کا فیصلہ ارباب حل وعقد کریں گے یا ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ قرآن کریم اس معاملے میں واضح ہدایات دیتا ہے جس سے جمہوریت کے فلسفہ عوام کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن جبل اللہ کے مقابلے پر جبل الناس کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور یہودیوں کے ذکر میں اس اصطلاح کا خاص محل ہے کہ یہ ہمیشہ جبل الناس کے ذریعے سامان زندگی مہیا کریں گے اور قیامت تک سہارے کے بغیر دنیا میں کبھی قیام نہ کر سکیں گے۔ خلافت عام آدمی کا مسئلہ ہی نہیں تھا حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اس کا جمہوریت سے کیا تعلق تھا یہ تو نعوذ باللہ آمریت تھی۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے ایک مجلس قائم کر دی یعنی امت میں سے صرف چند لوگوں کے لیے خلافت کو مخصوص کر دیا۔ اور اس کے انتخاب کی بھی ذمہ داری محدود کر دی۔ یہ کیا جمہوریت تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو جمہوریت کا اس میں کیا عمل دخل تھا؟ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں خون عثمانؓ پر اختلافات ہوئے نوبت جنگ تک آ گئی تو مسئلہ جمہوریت سے حل نہیں ہوا بلکہ دونوں اصحاب کرام نے حکم مقرر فرمائے اور ان کو فیصلے کا اختیار دیا۔ اتنے بڑے مسئلہ کا حل صرف دو افراد کے سپرد کر دیا گیا کہ یہ دونوں جو کچھ طے کر دیں وہ فریقین کے لیے واجب التعمیل ہوگا۔ اتنے اہم مسئلے میں عوام سے کوئی رائے لی گئی؟ خوارج اسی بنیاد

پر تو الگ ہوئے کہ حکم کی تقرری غیر قرآنی ہے پھر قرآن کے ان دعوے داروں نے جو کچھ کیا تاریخ کے اوراق خون سے تر بہ تر ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے لشکر اسامہ روانہ کیا، سب کا اختلاف تھا آپ نے کسی اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ فرمایا رسول اللہ کا حکم ہے موخر نہیں کیا جا سکتا اور خالد بن ولید کی موجودگی میں اسامہ کو لشکر برقرار رکھنے میں کوئی تردد محسوس نہ کیا کہ حکم رسول یہی ہے۔ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کے مسئلے میں تمام صحابہ کی رائے مختلف تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ یہ کونسی جمہوریت تھی، ہمیں تو اسلام میں کہیں مغربی جمہوریت نظر نہیں آئی، اور اسلامی جمہوریت تو کوئی چیز ہی نہیں ہے، معلوم نہیں اقبال مرحوم کو اسلام کی روح میں یہ جمہوریت کہاں نظر آ گئی۔ حضرت علیؓ کے وصال کے بعد حضرت حسنؓ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس کا فیصلہ کس جمہوریت سے ہوا؟ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے اور فرمایا کہ اگر خلافت معاویہؓ کا حق تھا تو انہیں مل گیا اور اگر میرا حق تھا تو میں اس سے دستبردار ہو گیا، اس سال کو امت کی تاریخ میں عام الجمع کا سال کہا جاتا ہے۔ جب امت پھر مجتمع ہو گئی تو امت کو حضرت حسنؓ نے مجتمع کیا یا جمہوریت یا ریفرنڈم ووٹ کے ذریعے یہ اجماع ہوا؟ طالوت کا انتخاب جمہوریت سے تو نہیں ہوا۔ عوام تو طالوت کے مخالف تھے ان کا انتخاب تو علمی اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوا، ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد حضرت داؤدؑ بادشاہ بنے، ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے سلیمانؑ ملک بنے، پھر ان کے صاحبزادے ہوئے۔

> اقبال مرحوم کی شاعری اور نثر میں بڑا فرق ہے۔ ایک دل کا معاملہ ہے، دوسرا عقل کا۔

قرآن نے طالوت کو ملک کہا، ذوالقرنین کو ملک کہا، کہیں ملوکیت کی مذمت نہ کی۔ بنی اسرائیل کے لیے سورۃ مائدہ میں فرمایا کہ ہم نے تم میں ملوک بھی پیدا کیے اور انبیاء بھی..... دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن یا اسلام ملوکیت کے خلاف ہے اور جمہوریت کے حق میں ہے باطل خیال ہے۔ اگر اقبال مرحوم کے جمہوری فلسفے کو مان لیا جائے تو قرآن کریم اور خلافت اسلامی کے طرز انتخاب کا انکار کرنا پڑے گا اور اسے غیر جمہوری قرار دینا ہوگا پھر اس بات پر بھی شرمندگی ہوگی کہ دو خلفائے راشدین رسول اللہؐ کے داماد تھے اور دو خلفائے راشدین سسر تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو سسر کے نواسے تھے کیا دنیا اس طریقہ کار کو جمہوری مان لے گی؟ *** مغرب کو خوش کرنے کے لیے جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرنے کی کوشش معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔ اقبال مرحوم اسلامی اصطلاح جمہور اور جمہوریت میں فرق نہیں کر سکے۔ ان کا یہ موقف کہ اسلام میں تصور خلافت جمہوریت کی شکل ہے درست نہیں ہے۔ جمہوریت ایک خاص تہذیب و تاریخ کا ثمر ہے۔ اسے اسلامی تاریخ میں ڈھونڈنا معذرت خواہی ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا تھا تو قرآن میں ملوکیت کا تصور اور خلافت راشدہ کے نظائر اقبال مرحوم کے اس موقف کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ اگر اسلام میں جمہوریت تھی تو پارلیمنٹ کیوں نہ تھی؟ اگر پارلیمنٹ عین اسلام ہے اجماع کا ادارہ ہے، اسلام کی فطری روح کے عین مطابق ہے تو عہد رسالت خلافت راشدہ اور قرآن کریم میں انبیاء کے معاشرے اس ادارے کے وجود سے ہمیں آگاہ کیوں نہیں کرتے، اتنے اہم اسلامی ادارے کا اسلامی تاریخ میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ بلکہ دنیا کی تاریخ اس وجود سے خالی ہے۔ اب سترھویں صدی کی خاص تاریخ سے نکلنے والی پارلیمنٹ ہی درست ہے باقی سب غلط ہے۔ یہ طرز فکر دوسرے لفظوں میں اسلام کی تاریخ اور انبیاء کی تاریخ کا انکار ہے۔ یونان کی جمہوریت اپنی تاریخ اور تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے، اسلام کو مغرب کے سیاسی نظام میں سمونے [یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام مغرب سے افضل ہے] کے لیے اقبال مرحوم کا نقطۂ نظر اسلامی علوم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اقبال مرحوم نے اصطلاح اجماع سے جمہوریت کا استنباط کیا ہے۔ اجماع کے لیے پارلیمنٹ کو موثر ترین اور معتبر ترین ادارہ قرار دیا ہے۔ اگر عالم اسلام کی ایک ہی پارلیمنٹ ممکن ہوتی تو شاید اقبال مرحوم کے اس مفروضے کی کوئی عقلی دلیل مل سکتی، لیکن قومی ریاستوں کی قومی پارلیمنٹوں کے ذریعے قومی اجماع، اجماع جمہور کا متبادل کیسے ہو سکتا تھا۔ اب پندرہ سو سال کے بعد جمہور کی اصطلاح بدل دی جائے تو شاید ممکن ہو۔ اقبال مرحوم صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ صرف چار مکاتب فکر کے اجماع کے تصور کو ختم کر کے اس تصور کو وسیع کر دیا جائے۔ صرف اقبال کے کہنے سے مکاتب فکر ختم نہیں ہو سکتے۔ اس امت میں بے شمار مکاتب فکر تھے، سب ختم ہو گئے، صرف چار رہ گئے۔ غیر فطری طریقے سے جو مکاتب ابھرے وہ فطری طریقے سے ختم ہو گئے، خطبات لکھنے اور تقریر کرنے سے نہ کوئی مکتب فکر وجود میں آتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ اس طرح کے دعوے بلنٹ نے اپنی کتاب میں کیے یا اس پر اس ہیچ مداں نے معارف میں دو قسطوں میں تبصرہ لکھا تھا۔ یہ اقبال کی زبان نہیں یہ تو بلنٹ کی زبان ہے۔ یہ عجیب وسعت ہے جو عالمگیر سطح پر متشکل ہونے کے بجائے قومی سطحوں پر قومی اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس طرح عالم اسلام میں کبھی اجماع ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے ذہن میں یورپ میں قومی کلیساؤں کے ظہور کی تاریخ واضح نہیں تھی۔ اقبال مرحوم کی اس تجویز سے اسلام کا انجام اس سے برا ہوتا جو عیسائیت کا ہوا قومی کلیساؤں نے عیسائیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اجماع جمہور کو جمہوریت اور پارلیمنٹ کی اصطلاحات کے مساوی قرار دینا علوم اسلام کی تاریخ سے کامل ناواقفیت کا اظہار ہے۔ یہ بھی خلط مبحث ہے، اسلام میں اجماع جہلاء کا نہیں ہے اجماع علماء کا معتبر ہے عوام کا نہیں یہ علماء کون ہوں گے اس کے بھی اصول طے ہیں اجماع کی اصطلاح ان تمام اصولوں کا کامل احاطہ کرتی ہے۔ لہٰذا جمہوریت اور جمہوری عمل کے تحت مطلق آزادی مطلق مساوات اور ایک انسان ایک ووٹ کا فلسفہ اجماع کی اصطلاح سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ جمہوریت خواہش نفس کا نام ہے کہ آپ کسے ووٹ دینا چاہتے ہیں، اس کے لیے کوئی شرط نہیں ہر شخص ووٹ دینے کا اہل ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن و سنت اس کافرانہ تصور کی صریحاً نفی کرتے ہیں۔ جاہل اور عالم، متقی اور فاسق، مشرکین منافقین، منحرفین مختلف طبقات ہیں۔ یہ تقسیم صرف عالم آخرت کے لیے نہیں اس دنیا کے لیے بھی ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ جاہل شخص نہیں بن سکتا نہ فاسق و فاجر کو امارت مل سکتی ہے کیونکہ فسق و فجور کا خاتمہ ریاست کا

بنیادی وظیفہ ہے جب کہ جمہوریت میں کوئی تحدید نہیں ہے۔ اقبال مرحوم نے خلافت کے خاتمے اور ترکی میں لادینی جمہوری حکومت کے آغاز کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا اور اپنے مقالے اجتہاد میں اسے مسلمانوں کی اجتہادی قوت کے نمونے کے طور پر پیش کیا، لیکن یہ اجتہاد جو آغاز میں بھی محض الحاد تھا، آخر کار الحاد کے سوا کیا نکلا۔ اسلام میں ایسے کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں جو بنیادی اصولوں کے بجائے محض نیک خواہشات کے لیے کیا جائے۔ حکومت کی جمہوری شکل کو عین اسلامی قرار دینے کی بات بھی اقبال مرحوم کے مغرب سے متاثر ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ اجماع کو لادینی سیاسی نظام کے جمہوری ادارے پارلیمنٹ کا متبادل سمجھنا اقبال مرحوم کی بہت بڑی غلطی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اس خیال سے رجوع کرتے۔ اقبال مرحوم اپنی فکر کا رشتہ شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ سرسید سے بھی قائم کرتے ہیں جب کہ سرسید قرآن کو کلام اللہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ سرسید اور مولوی چراغ علی کی خط وکتابت سے یہ ثابت ہوتی ہے جو شخص قرآن کو کلام اللہ ہی تسلیم نہیں کرتا اس سے اقبال مرحوم کا متاثر ہونا عجیب بات ہے۔ غالباً اقبال مرحوم نے سرسید کے افکار کا غائر اور تنقیدی مطالعہ نہیں کیا ورنہ اقبال مرحوم جیسے مومن سے اس غلطی کا صدور محال تھا۔

[ساحل، جون ۲۰۰۶ء، صفحات ۶۳-۶۷]

عہد حاضر میں اجتہاد کی شرائط

عہد حاضر میں اجتہاد پہلے کی نسبت زیادہ مشکل ہے کیونکہ اب ہمارا سامنا ایک ایسے فلسفے سے ہے جو یونانی فلسفے کی طرح مغلوب نہیں بلکہ دنیا میں غالب ہے۔ اس فلسفے نے علوم نقلیہ کا انکار کر دیا ہے اور عقل کو واحد ماخذ علم کو تسلیم کیا ہے۔ یہ فلسفہ مابعد الطبیعیات سے واقفیت کے لئے طبیعیات کو بے اثر پاتا ہے اور حقیقت تک عقل کے ذریعے پہنچنا چاہتا ہے جب کہ یونانی عقل کے ذریعے یہ ہفت خواں سر نہ کر سکے لہٰذا اب جو مجتہد ہو وہ صرف علوم اسلامی سے ہی واقف نہ ہو بلکہ اسے مغربی فلسفے اور جدید سائنس کے مباحث سے بھی کما حقہ، واقفیت ہو اس کے بغیر اجتہاد کرنا محال ہوگا، کیونکہ جدید مغرب نے جو سوالات پیدا کئے ہیں ان کا محرک ایجادات ہیں ایجادات کا محرک سرمایہ خواہش نفس، برتری، غلبہ اور انسان کے خدا ہونے کا دعویٰ ہے لہٰذا جدید مسائل کا فقہی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ وحاضرہ پر ہماری نظر نہ ہو۔ مثلاً آج کل نیاز جان جائیداد کی خرید وفروخت ہے، لوگ دکانیں خرید کر رکھ لیتے ہیں، منڈی میں جب طلب بڑھتی ہے تو قیمتیں بڑھا کر بیچ دیتے ہیں اس کے نتیجے میں مکان جو بنیادی ضرورت ہے، اس قدر گراں ہو گیا ہے کہ عام آدمی مکان خریدنے کا تصور نہیں کر سکتا یہ بھی احتکار کی شکل ہے جس طرح گندم وغیرہ روک لینا اور پھر مہنگا بیچ دینا جرم ہے، تو اس سے زیادہ سنگین جرم میری نظر میں یہ کام ہے یورپ وغیرہ میں تو اب مکان خریدنا لوگوں کے لئے ممکن نہیں، کچھ عرصے بعد یہی صورت حال پاکستان میں ہوگی۔ یہ کیپٹل ازم کا نتیجہ ہے۔ اب اگر ہمارے مولوی صاحبان سے کوئی فتویٰ لے تو نہایت سادگی سے فتویٰ دے دیں گے کہ جائز ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ لوگوں کو بنیادی ضرورت سے محروم کرنے والا کاروبار کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ حسب ضرورت جائیداد بنانا تو ٹھیک ہے لیکن اسے کاروبار بنا لینا اور ایسا کاروبار کہ عام آدمی کے لئے مکان خریدنا محال ہو جائے شریعت میں جائز نہیں۔ یہ مسئلہ عصر حاضر کا ہے لہٰذا کیپٹل ازم سے ناواقف علماء یقیناً اس کے جواز کا فتویٰ دیں گے اس لئے یہ ہیچ مداں کہتا ہے کہ علوم عقلیہ حاضرہ پر بھی مجتہد کی گہری نظر ہو۔ وہ اس عہد کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو۔ اقبال مرحوم کا المیہ یہ تھا کہ وہ علوم حاضر سے واقف تھے لیکن علوم قدیم اور علوم نقلیہ سے سراسر ناواقف اس کا ثبوت خطبات میں قرآنی آیات سے غلط استنباط ہے۔ خطبات میں نوے فی صد آیات کھینچ تان کر سیاق وسباق سے کاٹ کر مطالب اخذ کئے گئے ہیں۔ علمائے کرام کا المیہ ہے کہ وہ دینی علوم سے بخوبی واقف اور فلسفہ مغرب و سائنس سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ندوہ بنایا گیا تھا کہ فلسفہ سائنس پڑھایا جائے گا، شاہ سلیمان پھلواری کا خطبہ وضاحت کرتا ہے جو ندوہ کی تاسیس میں پڑھا گیا تھا کہ فلسفہ سائنس پڑھایا جائے گا، لیکن عملاً کچھ نہیں ہوا لہٰذا علماء اور جدیدیت پسند مفکرین کی حالت یکساں ہے جو صرف ایک دنیا سے واقف ہیں دوسری سے ناواقف۔ جس طرح علماء جدید دنیا کے معاملے میں جہل کا شکار تھے، اقبال مرحوم دینی علوم کے معاملے میں جہل سے قریب تھے۔ دونوں دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھ رہے تھے ندوۃ العلماء میں مغربی فلسفہ وسائنس نہیں پڑھایا جا سکا تو باقی دینی مدارس سے کیا شکایت۔ عالم عرب میں بھی یہی حال ہے۔ فلسفہ دراصل الہامی مذہب کا اصل مدمقابل ہے، اسے ہم عقلی مذہب کہہ سکتے ہیں لہٰذا اس مدمقابل مذہب سے واقفیت کے بغیر جدید مسائل کے سلسلے میں اجتہاد اگر کیا گیا تو وہ الحاد کے دائرے میں اضافے کا سبب بنے گا۔ اس سے مسلمانوں کو اور اسلام کو فائدہ پہنچنا مشکل ہے لہٰذا ان حالات میں قدیم فقہاء کا عاقلانہ نقطہ نظر صادق آیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ معاشرہ اور علماء جب وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں جو اجتہاد کی لازمی شرائط ہیں تو ان کا خاموش رہنا بہتر ہے کیونکہ لوگ اگر کسی چیز کو اختیار کریں گے تو دل میں شک اور وسوسہ بہر حال رہے گا کیونکہ اس عمل کی دینی توثیق وتائید تو نہیں ملی یہ کھٹک اور چبھن ایمان کی سلامتی کے لئے ضروری ہے کیونکہ دل کا مفتی مطمئن ہو جائے گا تو یہ چبھن خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر علماء نے مغرب کو جانے بغیر محض چند باتوں کے ذریعے جزئیات پر فتویٰ دیا اور کلیات سے تعرض نہ کیا تو الحاد کو اجتہاد کے دائرے میں پناہ ملے گی جس سے حلت وحرمت کے پیمانے بدل جائیں گے اور الحاد کو اسلامی حصار میسر آ جائے گا۔ یہ خطرناک ترین صورت ہوگی۔ فی الحال تو مجھے ایسا عالم نظر نہیں آتا جو اجتہاد کا اہل ہو کیونکہ مغرب سے واقف علماء آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، چند علماء نے انگریزی سیکھ لی ہے لیکن انگریزی سیکھنا اور فلسفہ جاننا دو مختلف دنیاؤں کا سفر ہے۔ ہمارے علماء کو جرمن اور فرانسیسی زبان سیکھنی چاہیے، فلسفے کے تمام امام ان زبانوں میں ملیں گے، انگریزی ترجموں کے ذریعے بھی فلسفہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن مجھے اس میں شک رہے گا کہ اصل متن کیا تھا؟ مسلم فلاسفہ پر اس سلسلے میں مغرب نے نقد کیا ہے کہ وہ جن افکار کو افلاطون سے منسوب کر رہے تھے وہ فلاطینوس کے تھے، ان کا اعتراض ہے کہ عرب افلاطون کے افکار ارسطو کے نام سے بیان کر رہے تھے۔ کیونکہ فلسفہ یونان ترجمے کے ذریعے سیکھا گیا لہٰذا یہ غلطی ہوئی ہوگی لہٰذا فلسفہ کو اس کی اصل زبان میں پڑھنا ضروری ہے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ آخر عمر میں فرماتے تھے کہ صرف

انگریزی سے کام نہیں چلے گا۔ علماء کو کم از کم دو یورپی زبانیں سیکھنا ہوں گی تا کہ فلسفہ کے ماخذات کا براہ راست مطالعہ کرسکیں۔ ندوہ میں انگریزی پڑھائی گئی لیکن یورپی زبانوں کی تدریس کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

اقبال مرحوم نے خطبات کا نام Re-Consturction رکھا، مجھے اس پر بھی اعتراض تھا، تعمیر نو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہوگئی۔ تشکیل نو کا مطلب دین کی از سر نو تعمیر کے سوا کیا ہے یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہوگئی۔ اب اسے از سر نو تعمیر کیا جائے یہ دعویٰ پوری اسلامی تاریخ کو مسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟ ان

> مغرب کو خوش کرنے کے لیے جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرنے کی کوشش معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔ اقبال اسلامی اصطلاح جمہور اور جمہوریت میں فرق نہیں کرسکے۔ ان کا یہ موقف کہ اسلام میں تصور خلافت جمہوریت کی شکل ہے درست نہیں ہے۔

امور میں اقبال مرحوم مغرب سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسلامی دنیا کو تیزی سے روحانی طور پر مغرب کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پیش رفت کی تحسین فرماتے ہیں، اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ فکری سطح پر یورپ کی تہذیب اسلامی ثقافت کی توسیع شدہ ترقی یافتہ شکل ہے، وسعت کے امکانات اسلام کے بیج میں تھے، لیکن درخت مغرب میں نکل آیا یہ عجیب تضاد ہے، افغانی سے اقبال مرحوم تک اسلام میں لوتھر کی ضرورت کا اثبات یہ ثابت کرتا ہے کہ سرسید افغانی، ابوالکلام، اقبال مرحوم وغیرہ اسلام کو Protestantize کرنے کے حامی تھے۔ ورنہ اسلام کی تعمیر نو کی بات عجیب بات ہے اسی بات کو کبھی عقلیت پسندی، کبھی تجدید مذہب کا نام بھی دیا گیا ہے اور کبھی اس کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ وہ لوتھر کی تحریک اصلاح کے منفی مضمرات کے قائل تھے حالانکہ پروٹسنٹ ازم نے جس قسم کی اباحیت کو جنم دیا، علماء اور فقہاء کی حیثیت کا جس طرح خاتمہ کیا، سرمایہ دارانہ نظم و تنظیم کے خادم کا جو فرض ادا کیا چرچ آف انگلیڈ کی صورت میں غیر اخلاقی طرز زندگی کو مذہبی جواز مہیا کرنے کا جو کام کیا اقبال مرحوم اس سے صرف نظر کرتے ہیں یعنی وہ مغرب کی صنعتی، مذہبی انحطاط وغیرہ کی تاریخ پر بھی بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ استعماریت کی تاریخ، کالونیل ازم کی تاریخ، براعظموں میں یورپی لوٹ مار، ہندوستان چین کی دولت لوٹنے کی تاریخ، براعظم امریکہ پر قبضہ، افریقہ میں سونے کی کانوں پر قبضہ، افریقی غلاموں سے صنعت میں بیگار، ان مباحث کے بغیر مغرب کو سمجھنا مشکل ہے۔ اقبال مرحوم مغرب کی ترقی کو ان تمام مباحث سے کاٹ کر غیر اقداری [Value Neutral] سمجھ کر اس کو اسلامی منہاج میں داخل کرنا چاہتے ہیں تا کہ مسلمان استخلاف فی الارض کے حقدار بن جائیں۔ لیکن کیا استخلاف فی الارض صرف سائنس وٹیکنالوجی اور ترقی سے ملتا ہے۔ کم از کم قدیم صحف سماوی اور قرآن حکیم اور انبیاء کے باب ہمیں ایسی رہنمائی نہیں دیتے۔ اقبال مرحوم نے خود اس نکتے پر غور کیا تھا اور مجھ سے استفسار کیا تھا کہ قرآن حکیم اور تاریخ انسانی کی روشنی میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جدید لوگوں کے یہ دعاوی کہ طاقت کا جواب طاقت، علم کا جواب علم، سائنس کا جواب سائنس اور ٹیکنالوجی کا جواب ٹیکنالوجی سے ہی دیا جاسکتا ہے۔ ایک باطل دعویٰ ہے اور سراسر مادیت پرستی کے مظاہر کی پرستش کا نام ہے۔ اگر یہ دعویٰ اور فلسفہ حق ہوتا تو قوم لوط عاد وثمود، اصحاب ارم، قوم سباء کو مٹانے والوں کے پاس اسی درجے کی سائنس وٹیکنالوجی صنعت وحرفت ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس تو فرعون کے زمانے کی سائنس و ٹیکنالوجی نہ تھی، مگر مصر تسخیر ہوگیا، قیصر وکسریٰ جب فتح ہوئے تو مسلمانوں کے پاس مسجد نبوی بھی کھجور کے تنوں اور چٹائیوں پر کھڑی تھی لہذا طاقت کا اصل سرچشمہ علم، سائنس وٹیکنالوجی نہیں وہ صحیح عقیدہ ہے جو روح کے اندر سما جائے اور خالق ارض وسماء کی قوت پر اسے وہ یقین حاصل ہو جو ایران فتح کرنے والوں کو تھا جب حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ تم مغلوب صرف گناہ کی وجہ سے ہو سکتے ہو، گناہ گار کبھی غالب نہیں آسکتا، یہ یقین اس درجے کا ہو جو حضرت ابوبکر کو حاصل تھا جب فتنہ ارتداد کے مقابلے کا اعلان کیا، فرمایا جو اونٹ کی رسی دینے سے بھی انکار کرے گا اس سے بھی جنگ کروں گا، ان کا یقین یہ تھا کہ کوئی باقی رہے یا نہ رہے حق کو باقی رہنا چاہیے، اس یقین کا نتیجہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ورنہ عقلی واستدلالی طور پر صحابہ کا آپؓ کو مرتدین سے جدال پر توقف کا موقف بہ ظاہر غلط نہ تھا لیکن اللہ والے دل کی آنکھ سے حقیقت کو دیکھتے ہیں انہیں حقیقت دکھادی جاتی ہے۔

امام غزالیؒ نے اجتہاد کو علم قرار دیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس کا مقصود کسی قانونی مسئلے پر آزادانہ رائے قائم کرنا قرار دیا ہے۔ المستصفیٰ میں اجتہاد کی جامع تعریف بیان کی گئی ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تقلید ترک کردی جائے۔ فقہی مذہب چھوڑ دیا جائے، تلفیق کے نام پر اتحاد امت کی بات کی جائے۔ اجتہاد کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر عہد میں تقلید کو ممکن بنا سکے اور کتاب وسنت کو اس ضمن میں مرکزی مقام حاصل ہو۔ کیونکہ تقلید بھی دین کے ماخذات سے اصول اخذ کرتی ہے اور عدم تقلید بھی ماخذات دین کا انکار نہیں کرتی۔ جمہور کے اصول تو یکساں ہیں فروعات میں اختلافات ہیں۔ تلفیق کے بغیر بھی آخر یہ امت اجماع پر قائم ہوئی یا نہیں۔ اہل حدیث آج بھی حنبلیوں کے ساتھ موانست رکھتے ہیں۔ کیا حنبلی مقلد نہیں ہیں اور اہل حدیث غیر مقلد۔ لیکن رشتہ محبت تو قائم ہے، تقلید اور عدم تقلید میں۔ اس امت میں اجتہاد ہوتا رہا ہے، اس کا دروازہ حکمت کے تحت بند کر دینے کے بعد بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ آخر ہمارے زمانے میں مفقود الخبر شوہر اور عورت کے مرتد ہو جانے پر نکاح ٹوٹنے کے مسئلہ پر اجتہادات ہوئے یا نہیں؟ شاتم رسول کے مسئلے پر بھی تو امت نے اجتہاد کیا ورنہ فقہ حنفی میں غیر مسلم شاتم رسول تو قتل کی سزا سے بری ہے، سزا صرف مسلم کو دی جا سکتی ہے کیونکہ غیر مسلم جب رسالت محمدی پر ایمان ہی نہیں رکھتا تو وہ سزا کا مستوجب کیوں ہوگا۔ لیکن اب احناف بھی شاتم رسول کو واجب القتل جرم قرار دیتے ہیں جب کہ ان کی امہات کتب میں اس مسئلے کا جواب مختلف ہے، فقہ مالکی شاتم میں مذہبی تفریق نہیں کرتی۔ اندلس میں عیسائیوں نے توہین رسالت کی ایک مہم شروع

کی، ہزاروں سرفروش کفن باندھ کر توہین رسالت کیلئے نکل آئے پہلے تو شاتم کو قتل کی سزا دی گئی لیکن جوش وخروش بڑھ گیا اور معاملہ سنگین ہو گیا تو پھر عیسائی پادریوں کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کیا گیا۔ عصر حاضر میں اجتہاد الحاد کا مترادف ہو گیا ہے اور اس کا مقصد محض آزادانہ بے باکانہ رائے ہے، لوگ صرف اپنی اپنی آوازیں سننے کو تحقیق اور اجتہاد سمجھ رہے ہیں۔ اپنی تاریخ، اپنے علوم، اپنے احوال وظروف کو مسترد کر کے اجتہاد آزادی فکر کا نام ہو گیا ہے جو خالصتاً مغربی نقطہ ہے جو کسی خارجی ذریعہ علم کا انکار کرتا ہے اور عقل پر تمام علم کا انحصار رکھتا ہے۔ اجتہاد میں معیار اور مرجع بہرصورت سلف رہیں گے لیکن جدید اجتہاد میں مرجع ترقی دنیا اور لذات دنیا کے حصول میں شرعی حیلوں کو تراشنے کا نام اجتہاد رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اجتہاد کو اصول حرکت قرار دیا ہیق ان کے پیش نظر مغربی فکر وفلسفے میں حرکت کی اصطلاح تھی وہ حرکت میں زندگی دیکھتے تھے جس نے مغرب کے زمین وآسمان بدل ڈالے تھے۔ جب وہ عالم اسلام پر نظر ڈالتے تھے تو انہیں جمود نظر آتا تھا۔ یہ جمود جن تاریخی اسباب سے پیدا ہوا تھا ان اسباب کا غائر مطالعہ کرنے کے بجائے اقبال مرحوم نے سیدھے سادھے لفظوں میں مستشرقین کے مغالطوں کو ترجمہ کر کے ''تقلید'' اور تصوف، عجمی، اثرات، ایرانی تصوف، کو اس جمود کا ذمہ دار قرار دیا۔ مغرب میں حرکت کسی خارجی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی لہذا حرکت کی خالص مغربی اصطلاح کو اسلامی منہاج میں برتتے ہوئے اقبال مرحوم نے اس کی نزاکت کا اندازہ نہیں کیا۔ بہ ظاہر یہ اصطلاح بہت دل کش لگتی ہے لیکن اس کے اثرات بہت روح فرسا نکلے ہیں۔ ترکی میں حرکت کا انجام سامنے ہے اقبال مرحوم کو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کس طرح عربی زبان کو مٹایا گیا، کیسے اذان پر پابندی لگی؟ کس طرح دینی مدارس بند کئے گئے؟ عمامہ پہننا حرام ٹھہرا، عربی زبان کی کتابیں تلف کر دی گئیں، ایک دور یہ بھی آیا کہ تجہیز وتکفین کے لئے کوئی مولوی دستیاب نہ تھا۔ یہ حرکت کی برکت تھی، آخر حکومت ترکی کو خود دینی تعلیم اور دینی مدارس کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ برا بھلا انتظام ایک نئے نظام میں ڈھل رہا ہے۔ اغنی دیس نے اسلامی قانون کو نیوٹن کے قوانین کی طرح معین سمجھا [Determined] اور اقبال مرحوم نے اس کے برعکس چراغ علی کی طرح ان میں زبردست حرکت کا مشاہدہ کیا جس طرح نیوٹن کے قوانین جامد تھے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جس طرح کائنات ایک مشین کے کل پرزوں کی طرح متعین طریقے کے مطابق حرکت کرتی ہے یعنی کائنات انہی متعین قوانین کے تحت چل رہی تھی، اسی طرح اس نے اسلام کے قانون فقہ کو جامد، ٹھہرے ہوئے پتھر کی لکیر قوانین قرار دیا..... نہ وہ اسلامی قانون کی اصلیت سے واقف تھا نہ اقبال، لہٰذا اعتراض بھی غلط تھا اور اس کا جو جواب اقبال مرحوم نے دیا وہ بھی غلط تھا۔ اعتراض کرنے والے نے مغربی اصطلاح میں فقہ اسلامی کا المیہ بیان کیا، ازالہ امالہ کرنے والے نے مغربی اصطلاح کے ذریعے ہی اس کا جواب دیا۔ قرآن کریم کا مقصد انسانی فلاح کے عمومی اصول مہیا کرنا تھا اس کی تعلیم زندگی کو ترقی پسندانہ تخلیق کا عمل ٹھہراتی ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح کے دعوے خطبات اقبال مرحوم میں بہت ملتے ہیں۔ یہ تمام دعوے اقبال مرحوم پر مغربی فکر وفلسفے کے حد سے زیادہ غلبے کا اثر ہیں سترہویں صدی سے پہلے پوری اسلامی تاریخ بلکہ ادیان سابقہ کے صحائف، دنیا کے تمام معاشرے، تہذیبیں، ترقی، فلاح، صلاح، تخلیق، حرکت،، ارتقاء کے ان کافرانہ تصورات سے عاری رہے جو فکر مغرب کے غلبے سے عام ہوئے حیرت یہ ہے کہ اقبال مرحوم مغربی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے اس کا تاریخی پس منظر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ اصطلاحات ایک خاص تاریخ تہذیب وثقافت سے نکلتی ہیں وہ زماں ومکاں میں محصور ہوتی ہیں اور اس کی اصطلاحات کو بھی آفاقی، غیر اقداری Value Neutral سمجھ کر نہایت سبک روی سے انہیں اسلامی تاریخ تہذیب فقہ میں داخل کرنے کی جسارت کرتے ہیں اس جسارت پر علماء کا احتجاج بے سبب نہیں تھا۔ لیکن احتجاج کرنے والوں کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا وہ فتویٰ دے کر چپ ہو گئے اقبال مرحوم اپنے عہد کے اسالیب میں گفتگو کر سکتے تھے انہوں نے اپنی غلط سلط بات بھی نہایت سلیقے اور تہذیب سے کہی بلکہ خطبات میں اسلام کے نصوص پر نقد اس قدر گھما پھرا کر کیا ہے کہ دس پندرہ مرتبہ پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس اسلام کے عقب میں تو صرف مغرب کا فلسفہ ہے، ان کی تحریر نہایت گنجلک ہے اور میرے خیال میں اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کی شدید تنقید کے بعد احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ طرز ایجاد کیا تھا تاکہ بات کہہ دی جائے اور گرفت بھی نہ ہو۔ اقبال مرحوم اسلام پر نقد کرتے ہوئے علماء وفقہاء اسلام سے حوالے لانے کے بجائے کفار محققین ومستشرقین کے حوالے سے اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو نہایت غیر ذمہ دارانہ عمل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علوم اسلامی سے بالکل واقف نہ تھے مثلاً حدیث کی حجت اور سنت کے مقام کے موضوع پر وہ حدیث کی تنقید میں Schacht اور گولڈ زیہر وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں اور ان پر تنقید بھی نہیں کرتے یعنی دین کے دوسرے ماخذ سنت کی حیثیت مستشرقین کے ذریعے متعین ہوگی علماء نے اسی لیے اسے کفر سے تعبیر کیا تھا علامہ حضرت انور شاہؒ نے اقبال مرحوم سے ملاقات میں انہیں مشورہ دیا تھا کہ آپ دینی علوم کی تحصیل کریں جس طرح آپ نے مغربی علوم کی تحصیل کی ماخذات کے متن خود علماء کی رہنمائی میں ان علوم کے اصولوں کے تحت مطالعہ کریں اور علماء سے مذاکرہ کے بعد اپنی آراء کا اظہار کریں جب آپ سات سمند پار سفر کر کے کفر کے علوم حاصل کر سکتے ہیں تو اسلامی علوم کے حصول میں وہی مشقت اٹھائیے اس کے بغیر سکوت اختیار کرنا بہتر ہے۔

اقبال مرحوم اپنے عہد کے اسالیب میں گفتگو کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی غلط سلط بات بھی نہایت سلیقے اور تہذیب سے کہی بلکہ خطبات میں اسلام کے نصوص پر نقد اس قدر گھما پھرا کر کیا ہے کہ دس پندرہ مرتبہ پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس اسلام کے عقب میں تو صرف مغرب کا فلسفہ ہے۔

اغنی دیس کی کتاب تھیوریز آف فنانس (Theories of Finance) میں اجماع کے ذریعے نص قرآن کی منسوخی کا نظریہ بعض علماء احناف اور معتزلہ کے حوالے سے پیش کیا گیا تھا لہٰذا اقبال مرحوم نے مجھ سے اس نظریے کے حوالے طلب فرمائے۔

یونانی الاصل عیسائی تر کی مفکر اغنی دیس کے اس ادعا کو اقبال مرحوم نے نہایت تحیر کے ساتھ محسوس کیا اس تحیر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ احناف اور معتزلہ کے فقہی ذخیرے سے واقف نہ تھے فقہی بصیرت رکھنے والا اور علم فقہ پر عبور رکھنے والے شخص کے لیے اس طرح کے مسائل حیرت انگیز نہیں ہوتے اقبال مرحوم جب ان سوالات کی تصدیق وتائید کے لیے علماء سے رجوع کرتے تھے تو ان دلائل کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کرنے اجتہاد، انحراف کرنے یا نقطہ نظر پیش کرنے کا حق بھی صرف علماء کو حاصل تھا یہ اقبال مرحوم کا مقام نہیں تھا اغنی دیس کے استدلال کی بنیاد علامہ آمدی، قاضی شوکانی اور عبدالعزیز بخاری کے دلائل پر رکھی گئی تھی اور اقبال مرحوم ان تینوں کی کتابوں سے واقف نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہانت دی تھی وہ صرف تخیل کے

> حنفی مکتب فکر پر اقبال مرحوم کا اعتراض کہ زندگی کی تخلیقی آزادی اور اس کے عدم تعین سے سہو نظر کر کے منطقی طور پر ایک کامل فقہی نظام کو احناف نے عقل محض کی بنیاد پر استوار کیا، فقہ اسلامی اور فقہ حنفی سے اقبال مرحوم کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔

ذریعے ایسے ایسے سوالات پیدا کرتے تھے جو سالہا سال مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں بھی نہیں آتے یہ درا کی ان کو دل دردمند کے ذریعے ملی تھی جو امت کے لیے دھڑکتا رہتا تھا اجماع کی نص قرآنی سے منسوخی کے سوال پر میں نے مختصر جواب تحریر کر دیا تھا کہ شاید وہ فکر کی درا کی کے ساتھ فقہ اسلامی کے لٹریچر کی غواصی بھی فرمائیں گے لیکن ایسا نہ ہوسکا ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ وہ مستشرقین، منکرین حدیث، ملحدین، مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں پڑھ کر اسلام پر وارد اعتراضات جمع کرتے ان کی علمی تنقیح کے بجائے مختلف علماء کے سامنے اشکالات پیش کر کے ان علماء کے جوابات سے اطمینان قلب حاصل کرتے یعنی اقبال مرحوم اپنے اشکالات کے ضمن میں صرف اور صرف تقلید علماء پر بھروسہ کرتے تھے یہاں ان کی اجتہادی قوت کام نہیں کرتی تھی اپنے لیے تقلید ضروری سمجھتے تھے اور عالم اسلام کے لیے اجتہاد لازمی سمجھتے تھے۔ پارلیمنٹ کے حامل ارکان کو بھی اجتہاد کی اجازت دیتے تھے لیکن خود پابند تقلید اجتہاد فرماتے یعنی علماء سے استفادہ کر کے اپنی رائے پیش کر دیتے۔ اس تقلید کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے میرے مختصر جواب کی بنیاد پر نہایت اعتماد سے اغنی دیس کے اس موقف کو کہ بعض حنفی اور معتزلی مصنفین کے نزدیک اجماع قرآن کو منسوخ کرسکتا ہے مسترد کر دیا۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ اقبال مرحوم اپنے علمی دعووں کی دلیلیں دوسروں سے حاصل کر کے اپنے نام سے پیش کرتے تھے ****۔ خطبات میں ایک اور مقام پر بھی اقبال مرحوم نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کی کتاب ''الکلام'' سے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ اصل سے تقابل کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا۔ یہ حوالہ درست نہیں تھا اور اس غلط حوالے سے جو استاد مرحوم مولانا شبلیؒ نے اخذ کیا تھا وہ بھی درست نہیں تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ حدود زماں و مکان سے ماورا ہیں اور قیامت تک نافذ العمل شاہ صاحب کا بھی یہی نقطہ نظر ہے لیکن اقبال مرحوم اغنی دیس کی تردید میں اتنے آگے چلے گئے کہ انہیں اسلامی سزائیں بھی قابل تغیر، ترمیم، تنسیخ نظر آئیں اس سے وہ اصول حرکت وارتقاء ثابت کرنا چاہتے تھے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کے یہاں انہیں اپنے مفروضے کے حق میں حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے عالم کی تحریف شدہ عبارت مل گئی یعنی نتیجہ پہلے اخذ کر لیا تھا اور دلیل بعد میں تلاش کی گئی۔ مقصد صرف اغنی دیس کی تردید تھا خواہ اس سے اسلام کی تردید ہو جائے۔ امت کی تاریخ میں منکرین حدیث کی بھی کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ حدود کو صرف جزیرۃ العرب کے معاشرے تک محدود سمجھتے ہوں، لیکن اقبال مرحوم نے اسلام میں اصول حرکت واجتہاد کو ثابت کرنے کے لئے نہایت نیک نیتی کے ساتھ حدود میں ترمیم، تبدیلی کا اصول بھی شاہ ولی اللہ جیسے جید عالم سے منسوب کر دیا۔ اقبال مرحوم کے لئے یہ بات حیران کن تھی کہ استاد مرحوم کے اقتباس میں تحریک کیسے ہوسکتی ہے۔ اگر وہ خطبات میں الکلام کے ثانوی ماخذ کا حوالہ دے دیتے تو انہیں شرمندگی نہ ہوتی، شاہ ولی اللہ کے نام سے غلط حوالہ پیش کرنا ایک ایسے خطبے میں جسے علماء کی نظر سے گزرنا تھا بڑی جرات کی بات تھی ماجد صاحب نے اس غلطی کو بھی واضح کیا تھا لیکن اقبال مرحوم پر یہ غلطی اس وقت واضح نہ ہوسکی۔ جب اقبال مرحوم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور امت کے اجماع کے برعکس رائے دی گئی ہے اور دلیل بھی محرف ہے تو وہ دل گرفتہ ہوئے مجھ سے خط وکتابت کے ذریعے استفسار کیا۔ دوسرے علماء سے بھی رجوع کیا۔ خطبات پر نظر ثانی کا وعدہ کر لیا تھا لیکن مہلت نہ ملی۔ اقبال مرحوم کے مسودات میں نظر ثانی شدہ عبارتیں مل سکتی ہیں۔ اقبال مرحوم کہتے تھے کہ تمام عمر مغربی فلسفے میں بسر کی ہے لہٰذا اسلام کی تعلیمات اور فقہ کا مطالعہ بھی دانستہ یا نادانستہ مغربی نقطہ نگاہ سے کرتا ہوں۔ اقبال مرحوم کا نقطہ نگاہ شک سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ بڑے شک پر ختم ہوتا ہے کیونکہ فلسفہ یقین کا نام نہیں وہ تو شک کا نام ہے شک کی وہ منزل کہ جب فلسفی خود اپنے آپ پر شک کرتا ہے اس کا تمام تر یقین شک پر ہوتا ہے۔ فلسفی کی زندگی تیقنات سے خالی رہتی ہے۔ خطبات کے سلسلے میں اقبال مرحوم پر جو حملے ہوئے اس نے انہیں از سر نو غور پر مجبور کر دیا تھا۔ آخری زمانے میں انہوں نے بارہا مختلف مجالس میں اعترافات کیا کہ میں نے مغرب کو منہاج بنا کر اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقہ کار درست نہیں تھا، اسلام کو کسوٹی بنا کر مغرب کو اس معیار پر پرکھنا چاہیے تھا تاکہ اسلام اور مغرب کے مابین مغائرت دور کی جاسکے۔ (ساحل، جون ۲۰۰۶ء، صفحات ۸۷-۹۴)

حواشی

(مدیر مسئول)

* ارتداد کے یہ مقدمات نہ تو پنجاب تک محدود تھے اور نہ ہی ان کا تعلق پنجاب کے کسی رسم ورواج سے تھا۔ فقہ حنفی میں نان نفقہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں بیوی کو عدالت سے رجوع کا حق نہ تھا نہ عدالت کو تنسیخ نکاح کا اختیار تھا (الہدایہ، ج ۲، کتاب الطلاق، باب النفقہ)۔ خاوند لاپتہ ہو تو جب تک اس کی موت کا غالب یقین نہ ہو جائے بیوی کو تنسیخ نکاح کے لیے عدالت سے رجوع کا حق نہ تھا۔ غالب یقین کے لیے مدت ایک سو بیس سال تھی (الہدایہ، ج ۲، کتاب النفقہ)۔ عورت تنسیخ نکاح کے لیے عدالت میں صرف دو صورتوں میں جا سکتی تھی۔ ایک اگر خاوند نامرد ہو (الہدایہ، ج ۲، کتاب الطلاق، باب العنین)، دوسرے خاوند یا بیوی کے ارتداد کی صورت میں (الہدایہ، کتاب النکاح، باب نکاح المشرک)۔

** غالباً یہاں محمد بن عبدالوہاب، جمال الدین افغانی اور گوکالپ پاشا مراد ہیں

*** صدر اسلام کی تاریخ کا جائزہ جس انداز سے یہاں پیش کیا گیا ہے، وہ دبستان شبلی کے نامور مؤرخ سید سلیمان ندوی کا اسلوب نہیں ہو سکتا نہ زبان کے اعتبار سے نہ حقائق کے اعتبار سے۔ اس جائزے میں اس سیاسی نقطۂ نظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو جمہوریت کی بجائے آمریت کا قائل ہے۔ یہ استدلال کہ قرآن اور اسلام ملوکیت کی تردید نہیں کرتے شخصی حکومت، استبداد اور مطلق العنانی کی تائید کرتا ہے، جو فرعون اور نمرود کی خصوصیت ہے۔ جمہوریت کی تردید کے شوق میں سید صاحب کبھی خلفائے راشدین کو آمر بنا کر پیش نہ کرتے۔

**** ان امالی کی زبان اور لہجہ کسی طرح بھی سید سلیمان ندوی کے شایان شان نہیں۔ اسی لیے ان کی سید صاحب سے نسبت مشکوک ٹھہرتی ہے۔ میں نے اپنی معروضات میں اس کی وضاحت کی ہے کہ سید صاحب نے جس تیقن کے ساتھ اغنی دیس کے حوالے کو رد کیا تھا علامہ اقبال نے اس پر انحصار کیا۔ سید صاحب کے حواشی سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وقت عبدالعزیز بخاری کی کتاب ان کے پیش نظر تھی اور نہ ہی اپنی زندگی میں کبھی اس کا ذکر کیا۔ اب ان امالی میں ان کے اچانک ذکر سے امالی کی صحت مشکوک ٹھہرتی ہے۔

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایک اہم ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور انشاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہو گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو جو جدید علوم سے بہرہ ہوں کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو۔ جن میں اعلی درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو اپنا وقت دین اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں اور ہم ان لوگوں کے لئے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شوروشغب سے دور ایک دارالاقامت بنا دیں جو ان کے لئے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے اور اس میں ہم ان کے لئے ایک لائبریری ترتیب دیں جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مزید برآں ان کے لئے ایک کامل اور صالح گائڈ کا تقرر کیا جائے جسے قرآن حکیم پر بصیرت تامہ حاصل ہو اور دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی با خبر ہوتا کہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ وحکمت اور اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انہیں مدد دے سکے تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لئے کوشاں ہو سکیں۔

آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامع ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں تاکہ وہ اس کام میں ہمیں مدد دے سکے۔ لازم ہے کہ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ تمدن اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت ہو۔

(اقبال بنام مصطفی المراغی، شیخ جامعہ الازہر)